علی گڑھ تحریک میں خطبات کا کردار

رابعہ قدوس
پی ایچ ڈی اسکالر (اردو)
ادارہ زبان وادبیات اردو، جامعہ پنجاب لاہور
ڈاکٹر محمد کامران
ادارہ زبان وادبیات اردو، جامعہ پنجاب لاہور

ROLE OF ELOCUTION IN ALI GARH MOVEMENT

Rabia Qudoos
PhD Scholar (Urdu)
IULL Punjab University Oriental College, Lahore
Muhammad Kamran, PhD
IULL Punjab University Oriental College, Lahore

Abstract

The art of oratory played a vital role in the political, social, ideological and cultural awareness of the Muslim of the Subcontinent. Sir Syed, Hali, Shibli, Mohsin-ul-Malik, Nazir Ahmad, Iqbal and Azad all were excellent in oratory. The Ali Garh Movement set a platform to sustain Muslim unity and oratory contributed a lot to broaden this platform. Resultantly, the Muslim could fight their battle fully well having realized their national political needs. It's why the history of the Subcontinent would have been incomplete without the reference of elocutions.The paper explores the role of Ali Garh Movement in creating literary, political, social, moral and economic awareness through elocutions.

Keywords:
حجۃ الوداع، یونان، برصغیر، علی گڑھ، محمد بن قاسم، شاہ عبدالعزیز،
خطبات، اُردو، خطابت

خطابت دراصل دعوت و تبلیغ، پیغام رسانی، افراد معاشرہ کی تربیت اور تہذیبی و ثقافتی نیز تعلیمی امور کا ایک طریق کار ہے۔ خطابت اور فن خطابت کے لیے انگریزی میں دو لفظ ایک ساتھ آتے ہیں۔ Oratory اور Rhetoric۔ The Random House ڈکشنری میں ان الفاظ کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

- Or-a-to-ry: The art of speech of an orator.(1)
- Rhet-o-ric: The study of the effective use of language.(2)

دراصل خطبہ وہ منضبط اور مربوط گفت گو ہے جو سامعین کے سامنے کی جائے جو موثر بیان، قوت زباں، بے مثل حافظے، موضوع کی صداقت، برجستہ انداز، روانی، ادائے مفہوم، ابلاغ، استدلال اور مثبت طرز فکر جیسے عناصر سے مزین ہو۔ دنیا کا سب سے قدیم ذریعہ ابلاغ خطابت ہی ہے کیوں کہ لکھنے کا فن اور رسم الخط کی ایجادات بہت بعد کی ہیں۔ عصر حاضر اور اس سے قبل چند برسوں میں اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی کے لیے جو ذریعہ زیادہ استعمال میں لایا جاتا رہا ہے وہ قلم، تحریر اور کتاب ہے۔ لیکن قدیم زمانے میں جب قلم، کتاب اور سادہ تحریر کا تصور تک نہیں تھا، اس وقت یہ خطابت کی رسی تھی جو سب کو جوڑے ہوئی تھی۔

جیسے جیسے نسل انسانی نے ارتقائی مراحل طے کیے ویسے ویسے تعلیم و تعلم کے سلسلے بھی آگے بڑھے اور انھی کے پہلو بہ پہلو تعلیمی دریچے وا ہوئے جنھیں ہم خطبات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مذہبی اور تاریخی شخصیات ،یونانی مفکرین و دانش وروں اور نقادوں کے افکار و نظریات نیز صوفیہ کرام کی اصلاحی باتیں اور اس قبیل کے دوسرے عناصر جو ہم کو حاصل ہوئے اگر ان کی صنفی حیثیت طے کریں تو انھیں خطبات کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان سب کا بنیادی اور عمومی میلان ہر اعتبار سے دانش ورانہ پہلو رکھتا ہے۔ دینی تعلیمات کے فروغ کا جذبہ ہو، معاشرتی اصلاح کی ضرورت ہو، میدان کارزار میں فتح کی خواہش ہو، سماجی شعور عام کرنے کی آرزو ہو یا ادب کی ترقی و ترویج کی تمنا ہو خطابت کی اہمیت ہر جگہ مسلمہ ہے۔

اردو زبان جو اپنی پیدائش کے اعتبار سے بہت پرانی نہیں ہے، اس میں ہر دور میں نئے نئے تجربات کیے جاتے رہے اور اس کو مسلسل سنوارنے اور نکھارنے کی کوشش جاری رہی۔ علما اور دانش وروں نے اس میں متعدد اصناف پر امتیازی خط کھینچا اور خطابت بھی اس کا ایک حصہ رہی بل کہ قدیم زبانوں میں خطابت کا رواج کچھ زیادہ رہا۔ نذیر الدین احمد کے بقول:

> ”خطابت کا اصل وجود یونان سے ہے۔ یونان جہاں تہذیب و تمدن کا امام اور علم و فن کا گہوارہ ہے وہیں وہ فن خطابت کا مسکن اور اس کی ابتدا و تدوین کا منبع بھی ہے۔“(۳)

یونان کے بعد خطابت میں روم سب سے پیش پیش نظر آتا ہے ۔ خطابت کا سب سے درخشندہ ستارہ سسرو (۴۳۔۱۰۶ ق م) کو کہا جاتا ہے جس کا تعلق روم سے تھا۔ خطابت کا چلن اسی سے عام ہوا۔ یورپ اور انگلستان کی سرزمین پر بھی ایک سے بڑھ کر ایک نام ور اور عظیم مقرر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی طاقت لسانی سے ایک دنیا کو اپنے سحر میں گرفتار رکھا اور ان کی تقریر کا جادو سب کے سر چڑھ کر بولتا رہا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ خطابت کی دنیا میں اہل عرب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے جہاں ایک وقت میں کئی کئی خطیب اور مقرر اپنی جادو بیانی کا جلوہ دکھاتے نظر آئے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ خطابت میں بھی وہ لاثانی تھے۔ انھیں اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان دانی پر اتنا غرور تھا کہ اپنے ماسوا کو وہ گونگا (عجم) گردانتے تھے۔ حضرت عمر فاروق حضرت امیر معاویہ اور دیگر اہل علم و فن کے علمی نقوش اور مآثر اس کا ثبوت ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کے خطبات سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ کا تاریخی خطبہ آج بھی اس دور کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ عرب میں خطبات کا دور آج بھی ہے۔ عرب ہی کیا پورے عالم اسلام میں خاص طور سے خطبات جمعہ کا دستور آج بھی قائم ہے۔ اسلامی تاریخ میں طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم کے خطبات نے مضمحل اور پژمردہ فوج میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ برصغیر کی تمدنی فضا نے جہاں دیگر اصناف ادب کو پروان چڑھایا وہاں خطبات کی بھی بھرپور آب یاری کی پھر خطابت نے بھی اپنا حق ادا کرتے ہوئے یہاں کی ادبی، سیاسی، سماجی، فکری اور تمدنی تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ تحریک سرسید ہو، تحریک آزادی، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، جدید ادب کی تحریک ہو یا اسلامی ادب کا تصور، سبھی کی کامیابی و کامرانی میں خطابت کا اہم کردار ہے۔ راجہ اشوک نے اس فن میں بہت سی جدتیں کیں۔ مہاتما بدھ اور مہابیر جین نے بھی اس کو فروغ دیا۔ پہلی بار ہندوستان میں لالہ بھگوان داس نے ''ہندوستانی'' میں تقریر کی اس کے بعد کئی ایک نام ور خطیب اس سرزمین نے پیدا کیے۔

ہندوستان میں اسلام پھیلانے میں خطابت اور وعظ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہ اسمٰعیل شہید (۱۸۳۱۔۱۷۷۹ء) اور شاہ عبدالعزیز (۱۸۲۳۔۱۷۴۶) جو شاہ ولی اللہ کے فرزند تھے، اپنے زمانے کے باکمال خطیب تھے۔ ہندوستانی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر شاہ عبدالعزیز اور انگریزی حکومت میں تحریک خلافت تک وعظ و خطابت کا ایک عظیم الشان سلسلہ موجود ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں خطبہ یا خطبات کا لفظ اول اول گارساں دتاسی (Garcin de Tassy)

کے حوالہ سے ملتا ہے جس نے فرانسیسی زبان میں ''ہندوستان میں اردو کی صورت حال'' کو موضوع بنا کر اپنے خطبات پیش کیے۔ بعد ازاں ان خطبات کا اردو ترجمہ بھی ہوا۔ ۱۸۵۰ سے ۱۸۶۹ تک ۱۹ سال پر محیط ۱۸ خطبات اس کتاب میں شامل ہیں اور یہیں سے اردو میں باقاعدہ خطبات کا آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے ارتقائی سفر میں علی گڑھ تحریک کی سب سے بنیادی اور ابتدائی حصہ داری دکھائی دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی، دارالعلوم دیوبند اور ندوہ جیسے اداروں نے بڑے خطبا پیدا کیے۔ علی گڑھ تحریک اردو کی وہ پہلی تحریک ہے جو علمی، ادبی تعلیمی اور دانش ورانہ جہات کے ساتھ ابھر کر پورے ملک پر چھا گئی، اس لیے یہاں ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ خطبات کا بھی بول بالا ہوا۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات کی بہ دولت مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت وجود میں آئی۔ بہ جا طور پر اس نے اپنے تاسیسی اجلاسوں، عوامی اجتماعات اور سیاسی جلسوں میں خطابت کے ذریعے اپنا سیاسی بیانیہ ایک طرف حکومتی ایوانوں اور دوسری طرف پسے ہوئے مسلمانوں تک پہنچایا تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ علی گڑھ تحریک نے بلاواسطہ اور بالواسطہ طور پر خطابت کے لیے راہیں ہم وار کیں۔ اس لیے اس تحریک سے وابستہ ہر فرد کی خدمات میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ علمی صلاحیتوں کے ساتھ خطابت کے فن سے مالا مال تھا۔ سرسید، مولانا حالی، شبلی نعمانی، محسن الملک، نذیر احمد اور علامہ اقبال سے لے کر مولانا آزاد تک سب نے خطابت کے جوہر دکھائے ہیں۔ سرسید نے نہ صرف قلم بل کہ زبان کو بھی نئی جہت عطا کی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تقریر اور خطابت کو نیا رخ دیا۔

سرسید کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے بھی متعدد جلسے مختلف مقامات پر منعقد ہوئے۔ ان جلسوں میں ملک کے مایہ ناز علما کرام اور دانش وروں نے اپنے خطبات سے علم و دانش کے دریا بہائے اور قوم کو سیراب کیا۔ یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قومی تحریک اور تحریک آزادی میں ان خطبات کا اہم کردار رہا ہے اور یہ خطبات بھی انھی تحریکوں کے سہارے ترقی کے مدارج پر پہنچے اور سند قبولیت حاصل کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے صدارتی خطبے ہندوستانی معاشرے اور آزادی کی تحریک کو کام یاب بنانے میں اہم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد یونیورسٹیوں میں جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کے موقع پر اور سیمی ناروں میں کلیدی خطبات کی روایت سے ادب میں ایک نشاط پرور فضا قائم ہوئی اور خطبات کو ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرنے میں کام یابی حاصل ہوئی۔

سرسید کے خطبات کا عظیم سرمایہ دیکھنے سے حیرت ہوتی ہے کہ سرسید نے کس قدر سرگرم قومی زندگی گزاری ہے۔ان کے خطبات کے موضوعات اور دائرہ کار سے احساس ہوتا ہے کہ اس شخص کے دل میں اپنی قوم کے مسائل کے لیے کیسا درد ہے اور وہ ہر وقت اس کے علاج میں سرگرداں ہے۔ سوتے جاگتے، خلوت و جلوت اور مجلس و تنہائی میں ایک لمحہ ایسا نہیں گزرتا جس میں اسے اپنی قوم کے ماضی، حال اور مستقبل کا صاف صاف نقشہ دکھائی نہ دے۔ سرسید کی تمام جہات اور حیثیتیں جیسے مصلح قوم، ماہر تعلیم، جدید نثر کے بنیاد گزار اور انشاپرداز کا منبع ان کے خطبات ہی ہیں۔ یہ کہنا بہ جا طور پر صحیح ہے کہ اردو دان طبقے میں سرسید وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے خطبات کی اہمیت وافادیت کو بہ طریق احسن سمجھا اور اس کا بہترین اور سلیقہ مند استعمال کر کے اپنی دانش ورانہ حیثیت کا عوام وخواص دونوں پر سکہ بٹھایا۔ فن خطابت کے لیے جن لوازمات کی ضرورت ہے وہ سرسید کی ذات میں بہ درجہ اتم موجود تھے۔

علی گڑھ تحریک نے اپنے آغاز میں ہی مقناطیس کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی باکمال لوگ علی گڑھ تحریک میں شامل ہوئے۔ شبلی، حالی، چراغ علی، امیر علی شاہ اور محسن الملک سمیت کئی نام اس فہرست میں شامل ہیں۔ اس سے قبل علی گڑھ تحریک کے اثر سے شبلی نعمانی نے اپنا ادارہ ندوۃ العلما قائم کیا جہاں سید سلیمان ندوی جیسے اکابر خطیب پیدا ہوئے جنھوں نے فن خطابت کو خوب پروان چڑھایا۔ سرسید کے رفقا اور علی گڑھ تحریک سے وابستہ افراد کی خدمات قابل قدر ہیں اور سب اپنی جگہ آفتاب وماہتاب ہیں اور سب نے حتی الوسع ادب کی خوب خوب خدمت کی ہے۔ حالی نے اپنے عالمانہ خطبوں، نظموں اور تنقید سے اس میں حصہ لیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنی بہترین دانش ورانہ صلاحیت کا استعمال کر کے خطبات پیش کیے۔ ان دونوں کے یہاں خطبات کے بالمقابل دوسری اصناف ادب پر زیادہ توجہ رہی۔

اس تحریک سے وابستہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴۔۱۸۵۷) وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے سرسید کی طرح خطبات کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا۔ ان کے خطبات کے مطالعہ سے ان کی ذہنی وسعت اور گہرائی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ درد وکسک اور قومی ہم دردی کے جذبے کی جھلک جتنی صاف ان کے خطبات میں دکھائی دیتی ہے ان کی نظموں اور دیگر تحاریر میں نہیں۔ وہ ہر وقت قوم کے دکھوں کا مداوا کرنے کی فکر میں رہتے تھے۔ تعلیم، مذہب، ہندوستان کی غلامی، قومی اداروں کے فروغ، قومی قیادت کا مسئلہ، عربی نصاب کی تجدید، عالمی سطح پر ہندوستان اور مسلمانوں کے احوال ایسے نہ جانے کتنے سنجیدہ اور دیرپا

امور ہیں جن پر شبلی اپنی عالمانہ نگاہ ڈال کر قوم کو بند آنکھیں کھولنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ علی گڑھ تحریک اور اس کے فرزندوں نے اردو ادب کو صحیح سمت پر لگا دیا اور وہ ایک رفتار کے ساتھ آگے بڑھنے کے لائق ہو گیا، خطبات بھی تمام اصناف کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھتے رہے۔

علی گڑھ تحریک تو ساری کی ساری تحریک آزادی کا ابتدائی چہرہ تھی اور اردو میں خطبات کی روایت کو بڑی سطح کی علمی اور سیاسی روایت اسی تحریک نے ہی بنایا۔ سرسید کے رفقانے گویا خطبات کی ایک بستی بسادی۔ اس فہرست میں محسن الملک، حالی، شبلی، نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، مولانا وحید الدین، نواب عماد الملک اور عبد الحلیم شرر پہلی صف کے یازمانی اعتبار سے پہلے دور کے ساتھی ہیں۔ دوسرے دور میں نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، خان بہادر حبیب اللہ، مولوی عبد الحق، مولانا ظفر علی خان، اکرام اللہ خان ندوی، مولانا احسن مار ہروی، سجاد انصاری، مولوی عنایت اللہ، سجاد حیدر یلدرم، عظمت اللہ خان، حسرت موہانی اور علی برادران شامل ہیں۔ تیسرے دور میں خواجہ غلام السیدین، عبد الماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی، قاضی عبد الغفار، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم احمد شجاع، الیاس برنی اور باری علیگ شامل ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے اثرات دور رس تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے غیر محسوس طریقے سے زرخیز ذہنوں میں اپنے آپ آب یاری کرتے گئے۔ مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴۔۱۸۷۲) ایسے نابغے بلاشبہ علی گڑھ تحریک کے فکری چشموں سے سیراب ہو کر اپنی راہ بدلنے پر مجبور ہوئے۔ مولانا سندھی کے خطبات سے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ بالخصوص تعلیمی نظریات کے حوالے سے تو اُن کی فکری مماثلت سرسید احمد خاں سے بہت گہری تھی۔ حیدر آباد سندھ میں ۱۹۴۴ کو جمعیت طلبا سندھ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''انگریزی کی سات کتابیں جو میٹرک تک پڑھائی جاتی ہیں اُنھیں ''کریما، نام حق'' کی طرح پڑھے اور اُن کی عبارت کو اپنے ہاتھ سے لکھنے کی مشق کرے اور انگریزی بولنے والوں کی مجلس میں بیٹھے اور انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ذہن نشین کرے اور اگر موقع ملے تو خود بھی انگریزی بولنے کی مہارت بہم پہنچائے۔ انگریزی کی پانچ کتابیں پڑھنے کے بعد ڈکشنری کی مدد سے وہ انگریزی اخبار کا مطالعہ شروع کر دے۔ اور جو وقت اس نے انگریزی سیکھنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور کسی چیز کو سیکھنے کی کوشش نہ کرے۔ اس

دوران وہ صرف انگریزی صحیح لکھنے اور سیکھنے اور بولنے کا خیال رکھے۔ایک ذہین اور محنتی عربی داں طالب عالم چھ ماہ میں یہ کام کر سکتا ہے اور زیادہ مدت درکار ہو تو ایک سال اس کے لیے کافی ہے۔'' (۴)

کیا اب بھی کوئی انکار کر سکتا ہے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے اثر کا ہی نتیجہ تھا کہ جہاں سے انگریزی زبان پڑھنے والوں کے خلاف اسلام اور مسلمان دشمنی کے فتوے آتے تھے، اب اُن مقامات سے انگریزی زبان پڑھنے کی اہمیت و افادیت کے لیے خطبات کے ذریعے پرچار کیا جارہا تھا۔ یعنی اُن مخالف کیمپوں میں بھی کچھ ایسے عالی دماغ لوگ موجود تھے جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ حقیقت کا ادراک کر لیا اور اُس پر عمل کرنے کے سوا اپنی کام یابی کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا۔اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ علی گڑھ کی تحریک اب ہندی مسلمانوں کے لیے یہ روایت ایک مضبوط اساس فراہم کر کے اس سلسلے کو بلندیوں کی طرف اُٹھا رہی تھی کیوں کہ سرسید کی تحریک نے جہاں سے اس کام کا آغاز کیا تھا کی سچائی اس قدر مضبوط تھی کہ مولانا مودودی (۱۹۷۹۔۱۹۰۳) جیسے خالص مذہبی نظریات رکھنے والے آدمی کو بھی کہنا پڑا:

''جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دست کش ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی بھی قوت نہیں بچا سکتی۔''(۵)

یہ اقتباس ثابت کرتا ہے کہ مولانا مودودی بھلے ایک عرصے تک انگریزی زبان پڑھنے کے مخالف رہے ہیں مگر تعلیم کی اہمیت کے وہ بھی منکر نہیں، جب کہ علی گڑھ تحریک کی کام یابی ہی یہی تھی کہ وہ تعلیمی ہتھیار کے ذریعے مسلمانوں کی حالت کو سدھار کر اُنھیں زندگی کے ہر شعبے میں مضبوط دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اُس کی اہمیت کو اس پہلو سے دیکھنے اور سمجھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ علی گڑھ تحریک والے اس حقیقت سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے کہ جب تک مسلمان جدید علوم سے خود کو آراستہ نہیں کر لیتے تب تک وہ جدید سیاست سے خود کو آشنا کرنے میں ناکام رہیں گے۔ یہ حکمت وتدبر کا وہ مقام ہے جو قدرت کسی کسی کو نصیب کرتی ہے شاید اُنھیں جن سے وہ کوئی بڑا کام لینا چاہتی ہے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں مسلسل اس مذہبی مخالفت کا رد کیا جو انگریزی زبان وعلوم کو مذہباً سیکھنا اور پڑھنا حرام قرار دیتے تھے جس کی بہ دولت مذہبی علما کی دوسری پرت میں ایسے بے شمار لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے علی گڑھ تحریک کے اس انسان دوست علمی موقف کی بھرپور تائید کے ساتھ اس میں عملاً حصہ بھی لیا۔

یہ سب سر سید احمد خاں کے پُر مغز خطبات اور مضامین کا حاصل تھا جس کی بہ دولت مسلمانوں میں سر سید اور علی گڑھ تحریک کے حامیوں کی مخالفت میں کمی آئی۔ علی گڑھ تحریک میں خطبات کی روایت کو بنیادیں فراہم کرنے والے شعبے ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے بنیادی مقاصد کا تذکرہ کریں تو قارئین کو اس تحریک کے خطبات کی روایت میں اثرات و اہمیت کا اندازہ زیادہ آسانی سے ہو گا۔

مقاصد کانفرنس:

۱۔ مسلمانوں میں یورپین سائنس و لٹریچر کے پھیلانے اور ترقی دینے اور اُنھیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم تک پہنچانے کے لیے کوشش کرنا۔ تدبیر علم پر سوچنا اور اُن پر بحث کرنا۔

۲۔ مسلمانوں نے جو قدیم زمانے میں علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرنا اور لوگوں کو آمادہ کرنا کہ وہ اس ضمن میں اردو میں یا انگریزی میں رسالے تحریر کریں یا لیکچر دیں۔

۳۔ اردو اور انگریزی زبان میں مشہور علما اور مصنفین اسلام کے سوانح حیات لکھنا۔

۴۔ مسلمان مصنفین کی تصنیفات جو نایاب ہیں اُن کے بہم پہنچانے کی تدابیر کرنا یا کھوج لگانا کہ وہ کس جگہ دست یاب ہیں۔

۵۔ زمانہ قدیم کے تاریخی واقعات کی تحقیقات پر رسالے کی تحریر یا لیکچر دینا یا مضامین لکھنا۔

۶۔ دنیاوی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیق پر رسالے کی تحریر یا لیکچر دینے کی تدابیر کرنا۔

۷۔ فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے ایک کتاب انشا کا مرتب کرنا۔

۸۔ جو انگریزی مدرسے مسلمانوں سے جاری ہوں ان میں اسلامی تعلیم کی حالت کو مد نظر رکھنا اور بہ قدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام دینے کی کوشش کرنا۔

۹۔ جو لوگ قدیم طریقے پر علما سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اُن کی حالت کی تفتیش کرنا اور ان میں سیاسی تعلیم کے قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدابیر کا عمل میں لانا۔(۶)

علی گڑھ تحریک کے اس شعبہ یا پہلو نے ہندوستان میں خطبات کی روایت میں یہ تاثر بہ جا طور پر پیدا کیا اور پھیلایا کہ ہم مسلمان ایک ہی ملک کے مختلف خطوں میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی حالت سے (چاہے وہ علمی ہو یا سیاسی و سماجی) سے باخبر نہیں بل کہ ہماری حالت یہ تھی کہ تب ہم ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں بسنے والوں کے حالات سے بھی خاطر خواہ طور پر آگاہ نہیں تھے۔ مذکورہ تحریک کے نتیجے میں خطبات کی روایت میں قومی شعور و قومی اشتراک میں بہتری آئی جو بہ جا طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل بات تھی۔

علی گڑھ تحریک کے اس ذیلی شعبہ (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کے دوسرے اجلاس میں اس کے اثرات نمایاں طور پر اُبھر کے سامنے آئے جب لکھنو میں منعقدہ اس کانفرنس میں بارہ مختلف اضلاع سے کانفرنس کے بارے میں آنے والی رپورٹیں پیش کی گئیں۔ ازاں بعد اس پر تیرہ قراردادیں پیش کی گئیں۔

علی گڑھ تحریک کا مذکورہ شعبہ معجزانہ اثرات کے ساتھ نمو پاتا نظر آتا ہے جب اس سلسلے کی تیسری کانفرنس ۲۷تا۳۰ دسمبر ۱۸۸۸ء کو منعقد ہوتی ہے تو اس میں شریک مندوبین کی تعداد ۲۵۸ تھی۔ اس کانفرنس کی خاص بات اس میں سرسید احمد خاں کی شخصیت کو اپنے ناول ''ابن الوقت'' میں شدید لعن و ملامت کا نشانہ بنانے والے ڈپٹی نذیر احمد نہ صرف اجلاس میں شامل تھے بل کہ ایک بصیرت افروز خطبے یا لیکچر کے ذریعے اپنا حصہ بھی ڈالا۔ یاد رہے کہ اس کانفرنس کی میزبانی انجمن اسلامیہ لاہور کر رہی تھی جو علی گڑھ کے اثر سے وجود میں آئی تھی۔

علی گڑھ تحریک کا نمایاں چہرہ ایک تعلیمی تحریک کے طور پر ہی نظر آتا ہے مگر اسی چہرے کے خدوخال میں دیگر عناصر بھی شامل ہیں جس سے ہمیں تحریک کے زیر اثر خطبات کی اہمیت کا درست اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر چوتھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں الہ آباد یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ایک حصے کو خارج کرنے کی استدعا کی گئی کیوں کہ اس میں اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں ناروا الفاظ تھے۔ یوں مذہب کا احترام و تقدس بحال کرنے کی روش بھی اس تحریک کے حصے میں آتی ہے۔ حالی اور شبلی ایسے مہا گرو خطیب اس تحریک کے نتیجہ میں ہمیں حاصل ہوئے۔ اس ضمن میں زیادہ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس تحریک کے ذیلی ادارہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے شہر شہر میں اعلیٰ خطیبوں اور خطبات کی روایت کو بڑھاوا دیا۔ اس سے زیادہ لوگوں تک اصلاح مسلمانان ہند کا کام چل پڑا۔ علم وادب کے نئے خزانے دریافت ہونے لگے۔ قدیم قلمی نسخوں اور مخطوطوں کی بازیافت عمل میں آنے لگی۔ مختصر یہ کہ علی گرھ تحریک کے زیر اثر کئی اور تحریکات نے جنم لیا جو مختلف النوع کاموں میں مصروف ہوئیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر خطبات کی اہمیت و ضرورت یہ تھی کہ مذکورہ تحریک جب دیسی فنون سے متعلق کتب کی تدوین، انجمن حمایت اسلام لاہور کی درسی کتب کے طلبہ کے لیے اشاعت، گورنمنٹ سکولوں اور کالجوں میں زیر تعلیم مسلمان بچوں کے لیے مذہبی تعلیم کا اہتمام

اور ساتھ ساتھ طب یونانی سکھانا، یہ تمام کام اُسی وقت اپنا تسلسل بحال و برقرار رکھ سکتے تھے جب زیریں پرت میں بہ طور ایک تحریکی تسلسل کے خطبات کی روایت چل رہی ہوتی۔ ہمیں اس تحریک کے زیر اثر خطبات کی روایت اس لیے بھی درکار تھی کہ مسلمانوں میں خواب غفلت سے بیداری اور قومیت کا ولولہ دائمی طور پر تازہ رہے اس میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ مسلمانان برصغیر اپنی قومی و سیاسی ضرورتوں سے مستقلاً آگاہ ہوتے رہیں۔ ان کا ایسا نہ کرنا در حقیقت اس قانون قدرت سے انحراف کرنا ہوگا جس کے ذریعے قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ یہ ملت بیضا میں مسلسل بیداری کے صور پھونکنے جیسا عمل تھا۔ بلاشبہ تحریک کے اثر سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور متعدد شعبوں میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تاریخ میں اس سے نئے باب کا اضافہ ہوا۔

علی گڑھ تحریک کے وسیلے سے قومی تعلیم گاہیں وجود میں آئیں، تعلیمی مصارف کے اسباب پیدا ہوئے۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں، اسلامی علوم و فنون، مدارس شبینہ، صنعت و حرفت، تجارت وزراعت سمیت کئی شعبوں میں آگے لانے کی مساعی کی گئیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقدمے میں آغا حسین ہمدانی لکھتے ہیں:

> ''اس تحریک سے بہت عمدہ رسالے، مضامین اور لیکچر ایسے تیار ہوگئے جن سے اردو لٹریچر میں ایک معقول اضافہ ہوا۔ جیسے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، الجزیہ، مضمون کتاب خانہ سکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے اسباب، ابوریحان البیرونی کی لائف، کتاب کلیلہ ودمنہ کے تاریخی حالات، اشاعت اسلام بلا استعانت حسام (تلوار کے بغیر اسلام کی اشاعت) شمس العلماء مولانا نذیر احمد اور نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لیکچر و تقاریر وغیرہ۔''(۷)

ان خطبات اور کتب کی بہ دولت مسلمانوں کی علم و فن میں دل چسپی بڑھی جس سے لوگوں میں حکمت و دانائی کے اقدار کو پختگی نصیب ہوئی۔ بیس سالہ کانفرنسوں کے خطبات نے ایک پورے زمانے کی تصویر بنا کر رکھ دی جس میں ہمیں ہر منظر دکھائی دیتا ہے کہ کب کن حالات کے تحت کیا امور کیسے سرانجام دیے گئے۔ جہاں ایک طرف مسلمانوں کے قلوب و افکار اس تحریک کے اثرات سے پیدا ہونے والی دیگر سرگرمیوں کے نتیجے میں روشن خیالی اور وسعت نظری سے آگاہ ہونے لگے یوں انھیں اپنے معاشی حق اور اُس کی اہمیت و ضرورت کا بھی اندازہ ہونے لگا۔ اس سے مسلمان بالخصوص پہلے کی

نسبت بڑی حد تک تعلیمی میدان میں آگے آئے۔ پہلی مرتبہ مسلمان اس قابل ہوئے کہ وہ اپنی مالی مشکلات کچھ کم کر سکیں۔ جیسے ہی مسلمانوں کی معاشی حالت کچھ سنبھلنے لگی تو ان کی معاشرتی زندگی پر اثرات اپنے آپ دکھائی دینے لگے۔ علی گڑھ تحریک نے دراصل مسلمانوں کی اجتماعیت کو قائم رکھنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ اس کے اثر میں نمو پانے والے خطبات کی اہمیت و ضرورت یوں تھی کہ انھوں نے اس پلیٹ فارم کو مزید وسعت دی تاکہ زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق مسلمان اپنا مقدمہ پوری طرح سے لڑ سکیں۔ ۱۹۰۴ء میں جسٹس بدرالدین طیب نے عمائدین کانفرنس اور گورنر کی موجودگی میں کانفرنس کے فورم سے ہی مسلمانوں کو اب سیاسی معاملات میں حصہ لینے کو کہا۔ ٹھیک دو سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت بنائی تاکہ وہ اپنے حقوق کی آئینی و قانونی لڑائی لڑ سکیں۔ نواب عمادالملک نے ۱۹۱۱ء کے صدارتی خطبے میں کہا کہ میری رائے میں مسلم لیگ بھی اسی تحریک کے نتائج میں سے ہے۔ مختصر یہ کہ ۱۹۰۶ء میں بننے والی مسلم لیگ، تحریک علی گڑھ کی توسیع کی ہی ایک صورت تھی۔

اگر کوئی محقق یا مورخ ہوش مندی سے اس امر کا جائزہ لے تو علی گڑھ تحریک میں محض ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبات چالیس برسوں کی تاریخ پر محیط ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں چالیس مختلف جگہوں پہ مختلف لوگوں نے پہلے سماعت کیا ہوگا۔ یقیناً وہ سب لوگ کسی ایک شہر، مقام یا جگہ کے نہیں ہوں گے بل کہ دور دراز علاقوں سے اُن میں شرکت کی ہوگی۔ پھر اُس زمانے کے اخبارات ورسائل نے بھی اُنھیں کچھ نہ کچھ اپنے انداز میں چھاپا ہوگا یوں یہ ہندوستان کے چپہ چپہ میں پھیل گئے ہوں گے۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے، وہ ہے ان خطبات کا لسانی پہلو کیوں کہ اُس زمانے میں اردو زبان اپنے ارتقائی مدارج طے کرنے میں مصروف تھی پھر ہر شہر وعلاقے کے لب ولہجے میں بھی ایک طرح کا تفاوت تھا۔ یوں ہر خطبے کی لسانی لطافت و صورت دوسرے خطبے سے مختلف ہے۔ اسی بات کا تذکرہ آغا حسین ہمدانی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''خطبات کی ترتیب و تکمیل کیوں کہ چالیس سال میں انجام پائی، اس لیے زبان میں تدریجاً جو انقلابات اور تبدیلیاں ہوتی رہیں اور طریقہ ادا، طرز استدلال، اسلوب بیان اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے زبان میں جو ترقی ہوئی ان سب کا اندازہ اس کتاب سے ہوتا ہے۔''(۸)

کہاجاتا ہے کہ کانفرنس کے پہلے سات خطبات تو بہت سادہ رہے مگر آٹھویں خطبے سے ان خطبات میں ایک خاص طرح کی ادبی چاشنی جھلکنے لگی جس کے بانی نواب محسن الملک قرار دیے جاتے ہیں۔ اردو زبان کے لسانی ارتقائی معاملے میں ان خطبات کا مطالعہ خاصے کی چیز ثابت ہوگا۔ لسانی اعتبار سے فطری طور پر یہ وصف اردو کی اور کسی بھی کتاب کو حاصل نہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی اور آخری ایسی کتاب ہے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں سے بالغ نظر مسلمانوں اپنی خطابت میں وہ سنجیدہ تبدیلی لائے جس کی بہ دولت یہ معلوم ہونے لگا کہ مسلمانوں کے لیے کیا مفید ہے اور کیا غیر مفید۔ اس تحریک کے اثر سے خطابت کے ایسے ایسے نابغے سامنے آئے جنھوں نے اگلی نصف صدی برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے اس علمی وادبی اور سماجی ہنر سے خوب سیراب کیا، ان میں نواب یار جنگ بہادر، مولانا حاجی حبیب الرحمن، مولوی انوار احمد، محمد زبیر مارہروی کے نام کلیدی طور پر لیے جاسکتے ہیں۔

تحریک کے اثرات سے جو خطبات وجود میں آئے ہوں گے وہ اب تک تو بھولے بسرے ہو چکے ہوں گے اُنھیں کسی مجموعے کی شکل میں لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جو نسلیں اب تک انھیں دیکھنے، سننے، پڑھنے سے محروم ہیں وہ اس سے محظوظ و مستفید ہو سکیں کیوں کہ وہ محض سخن دانی یا سامعہ نوازی کا عمل نہیں تھا بل کہ ہمارے پُرکھوں کی برس ہا برس کا ایسا فکری تاریخی گل دستہ ہے جس میں رنگ برنگ افکار کے پھول سجے ہیں۔ جن باوقار لوگوں نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور چلایا تھا وہ سب بہ جا طور پر اپنی قابلیت اور استعداد کے اعتبار سے اپنے اپنے وقت کے جید لوگ تھے۔ اُن کا مقام محض علمی ہی نہ تھا بل کہ وہ ملی ہم دردی اور اصابت رائے ایسی خوبیوں سے بھی مزین و آراستہ تھے۔ دوسرے لحاظ سے وہ لوگ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی رہبری و فلاح کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

ان خطبات کی روایت اس لیے بھی اہم ہے کہ ہم آئندہ وقتوں کے لیے ان خیالات کی آگاہی سے اپنی لغزشوں سے آشنا ہو کر قومی مفاد کی خاطر زندگی کے بہتر اطوار سیکھ سکتے ہیں۔ کیا یہ ایک باکمال کام نہیں ہوگا؟ کہ آپ تھوڑی محنت کے بعد تقریباً ایک صدی پر محیط مسلمانانِ ہند کی علمی، سیاسی و سماجی جدوجہد کی پوری روایت سے کماحقہ آگاہ ہو جائیں گے۔ یہ خطبات نہ صرف باکمالوں کی رائے، ان کے تجربے، اور ذہنی و دماغی قوتوں کو آپ کے سامنے لاتے ہیں بل کہ اُن کے ساتھ ان مشاہیرِ قوم کی مختصر سوانح بھی اس میں شامل کی جاتی ہے جس کے مطالعہ اور پیروی سے ہماری زندگی کی دشوار گزار منزل آسانی سے کٹ سکتی ہے۔ ان نوشتوں پر عمل کرنے سے ہم اپنی قومی خصوصیات کو عملی و علمی لحاظ سے پھر واپس لا سکتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر خطبات کا اہم ترین حوالہ یا روایت مسلم لیگ کے خطبات ہیں، اگر ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں تو ہماری قومی تاریخ اور قومی سیاسی تحریک و تاریخ کا نام و نشاں تک نہ بچے گا۔ سید الطاف علی بریلوی کی کتاب ''تخلیقات و نگارشات'' ایک ایسی کتاب ہے جو ہم پر ان حقیقتوں کو روشن کرتی ہے جن کا ابھی ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کی شاہ کار علمی کاوش ''سخن دان فارس'' بھی در حقیقت خطبات کا ماحصل ہے، یہ نو لیکچرز پر مشتمل ہے جس میں فارس (ایران) کی علمی روایت، اُن کے قدیم ادب اور علمی فن پاروں کے بارے تحقیقی نوعیت کی اعلیٰ معلومات، نمایاں علمی شخصیات اور اُن کے کام کے حوالے سے شبلی کے شعر العجم کے بعد یہ سب سے اعلیٰ کام ہے۔ علی گڑھ تحریک کے بعد کے جو خطبات یا لیکچرز ہیں وہ ایک طرح سے نہیں بل کہ کئی پہلوؤں سے ہماری علمی، سماجی و سیاسی زندگی میں ہمارے معاون اور مددگار ہیں جن کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا عبید اللہ سندھی خالصتاً مذہبی علما میں سے وہ شخصیت ہیں جن کے افکار و خیالات میں جدت، اسلام کا حقیقی تصور اور اسے عصری تقاضوں سے باہم مربوط دیکھنے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت ملتی ہے۔ مولانا سندھی کے خطبات میں جہاں اُن کے اپنے علم و فضل اور ذاتی تجربات و مشاہدات کا دخل ہے وہاں بہ جا طور پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ سر سید کی تحریک میں جو علمی و تہذیبی پہلو تھا اُس میں تو کوئی بڑا مخالف بھی اُس کا رد نہیں کر سکتا۔ مولانا سندھی کے خطبات میں ہمارے ہاں کی طبقاتی و معاشی ناہم واری اور دین کے نام پر کاروبار کرنے والوں کو کھلے بندوں چیلنج کیا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح سر سید اپنی زندگی کے آخری ایام تک اپنے مشن کے ساتھ جُڑے رہے مولانا عبید اللہ سندھی بھی جب ۱۹۳۹ء میں وطن لوٹے، تو جسمانی طور پر بہت نحیف و عمر رسیدہ ہو چکے تھے مگر ایک انقلابی کی طرح اپنے مشن سے پیچھے نہیں ہٹے۔ محمد سرور لکھتے ہیں:

> ''مولانا نے بارہا اپنے خطبات میں کہا کہ کم سے کم موجودہ حالات میں اگر اتنا ہو جائے گا کہ گاندھی جی کی کانگریس اور مسٹر جناح کی مسلم لیگ آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو مولانا کے نزدیک اس کا ایک فائدہ تو یہ ہو گا کہ موصوف کے ذہن میں کل ہند کانگرس کا جو تصور ہے اس سمجھوتے سے اس کی طرح پڑ سکے گی اور دوسرا اس سمجھوتے کی وجہ

سے جہاں تک ہندوستان کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے ہم برطانیہ کے اقتدار کو بہت حد تک بے اثر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔''(۹)

مسلم لیگ اور مسلمانوں کا سیاسی بیانیہ اُس وقت کے ہندوستان میں علی گڑھ تحریک کے اثرات سے یہ نکلا تھا جو آہستہ آہستہ کئی تحریکوں کی صورت میں پھیلتا گیا اور یہ سیاسی آواز بھی موثر اور توانا ہو گئی اس لیے ہم اس تحریک کے بعد کے جتنے بھی خطبات ہیں یا اردو ادب میں ان کی جو بھی روایت بنی ہے اُسے اس سارے عمل کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔اس لیے ان کی ضرورت واہمیت پر تو کسی بھی طرح کا کوئی سوال اُٹھتا ہی نہیں ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے خطبات تو مذہبی علما اور عام لوگوں کو بھی قوم پرست بننے کی دعوت دیتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی علی گڑھ تحریک کے بعد ہندوستان کے اس معنوی وجود کے حقیقی اور اعلیٰ شارح تھے۔ ایک مسلمہ مذہبی عالم بھی اور ایک ایسے وقت میں جب مسلمان اپنی آزادی پانے میں سرگرداں تھے اُنھیں ایک مربوط سیاسی فلسفہ اور نظام پیش کرتے ہیں۔اُن کے خطبات آج تاریخی دستاویز کے طور پر موجود ہیں۔

مولوی عبدالحق اُردو ادب میں تو ایک ممتاز و منفرد مقام رکھتے ہی ہیں مگر خطبات کے حوالے سے بھی جو اعزاز انھیں حاصل ہے شاید کسی اور کو ہو۔ وہ علی گڑھ تحریک سے بالواسطہ طور پر مکمل جڑے رہے۔اس لیے اُن کے خطبات کا مذکورہ ضمن میں آنا ہر صورت ناگزیر ہے۔ شاید مولوی صاحب ہی واحد ایسی ہستی ہیں جن کے خطبات کے بارے میں ادبی ناقدین بغیر کسی ہچکچاہٹ کے یہ مانتے ہیں کہ اُن کے خطبات نہ صرف ہئیت و لہجہ کے اعتبار سے بل کہ موضوعاتی لحاظ سے بھی ادب سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون ''خطبات عبدالحق'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب کے یہاں بھی دوسروں کے خطبات کی طرح برعظیم کے تمام سیاسی رُجحانات، ذہنی محرکات، معاشی مشکلات اور قومی انقلابات کا ذکر آیا ہے لیکن عام طور پر ان کے موضوعات پر ادبیات و لسانیات کا اثر غالب ہے، پھر چوں کہ مولوی صاحب کے سادہ نگار قلم نے ان میں ایک خصوصی قسم کی سادگی و پُرکاری اور بے خودی و ہشیاری کی کیفیت پیدا کر دی ہے، اس لیے ان کی اہمیت اردو ادب میں غیر معمولی ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب کے خطبات سننے والوں پر جادو اثر کرتے تھے۔ مگر ان کا دائرہ عمل خطابت کی تنگ فضا تک محدود نہیں ہے بل کہ ان میں حاضرین کے حلقے سے باہر نکل کر دور تک ایک خاص فضا پیدا کرنے کی قوت ہے۔''(۱۰)

اگر ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو خطابت صحافت کے کسی قدر قریب کی کوئی چیز ہے۔اس میں نسبتاً وقتی تاثر کی طاقت مستقل اثر پذیری سے زیادہ ہوتی ہے۔اس کے باوجود بھی اگر ہم مولوی عبدالحق کے خطبات سامنے رکھیں تو صرف مذکورہ سچائی اُن پر صادق نہیں آتی بل کہ یہ خطبات اپنی زود اثری کے ساتھ ساتھ کسی ادبی فن پارے کی طرح دیر پا اثر کی خوبی بھی لیے ہوئے ہیں۔یوں ان خطبات کے ذریعے کسی بھی تحریک کا ایک غالب پہلو اہم ادبی جُز بن کے سامنے آتا ہے۔ڈاکٹر سید معین الرحمن نے تو مولوی عبدالحق کے خطبات کو ادب میں وہ مقام دے رکھا ہے جو مکتوب نگاری میں غالب کو حاصل ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ خطبات کے بغیر نامکمل ہے کیوں برصغیر میں رونما ہونے والے بیش تر سیاسی و ادبی واقعات کی اگر کوئی مستند دستاویز بنتی ہے تو وہ یہ خطبات ہی ہیں ورنہ دوسری شہادتیں ان کے مقابلے میں نسبتاً کم زور ہیں۔اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ خطبات میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ کسی خاص مطالعے کا حاصل نہیں بل کہ اس میں مشاہدہ اور تجربہ کو بلا واسطہ دخل ہے۔اس لیے خطبات میں واقعات کی سچائی اپنی روح کے ساتھ موجود ہے جو کم از کم کسی بھی مورخ کو اپنے تاریخی شعور یا تحقیق سے حاصل نہیں ہو پاتی۔اور تذکرہ اگر مولوی عبدالحق کے خطبات کا ہو تو یہ اور بھی معجزاتی حد تک سچ ہے کہ ان کے خطبات میں کوئی چند برس یا دہائیوں کا ذکر نہیں بل کہ قریب ایک صدی کی اجتماعی زندگی کے سبھی اُتار چڑھاؤ کی تفصیل دکھائی دیتی ہے۔مجموعہ مطالعات عبدالحق کے مطابق:

> ''مسلم لیگ کے قیام ۱۹۰۶ء سے بہت پہلے سرسید کی اصلاحی تحریک عین آغاز سے قیام پاکستان کی ذہنی تحریک کا مکمل خاکہ وجود میں آگیا تھا۔مولوی عبدالحق کے خطبات میں سرسید احمد خاں کے قومی نظریے، ان کے سیاسی مسلک اور اُن کے اصلاحی نقطہ نظر کی وضاحت ہے۔ان میں ہندو مسلمانوں کی ذہنی ساخت اور ان کے طبعی رُجحانات، دو قومی نظریے کی تحریک کے اسباب و محرکات اُن کے نتائج و تاثرات کی تفصیل ہے۔ان میں اردو ہندی تنازع کی اور اس تنازع کے اسباب و علل کی مکمل تصویر ہے۔ان میں اردو ہندی زبانوں کے آغاز و ارتقا، ان کے باہمی تعلقات اور عروج و زوال کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ان خطبات میں پاک و ہند کی وہ صد سالہ تاریخ محفوظ ہے جس کا خاکہ اقبال اور ان سے پہلے سرسید اور اُن کے رفقا کار کے ذہنوں میں تیار ہو چکا تھا۔اس ذہنی خاکے پر نظر ڈالے بغیر پاکستان کے موجودہ نقشے کو سمجھنا دشوار ہے۔یہ وہ چند باتیں ہیں جو مولوی صاحب کے خطبات کی تاریخی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔''(۱۱)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثرات خطبات کی جو روایت وجود میں آئی وہ ہمارے لیے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لیے کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ خطبات ہی وہ واحد دستاویزی ثبوت و سچائیاں ہیں جن کی مدد سے ہمیں اسلاف کی جدوجہد، عظمت و محنت کا حقیقی چہرہ معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ اور بالخصوص تحریک پاکستان کی حقیقی تاریخ کے درست ترجمان یہی خطبات ہیں۔ اس لیے انگریز سامراج کی قبضہ گیری، جارحیت اور پھر اپنے بزرگوں کی علمی، اصلاحی اور سیاسی کوششوں کی کتھا بھی ہمارے ساتھ سب سے بہتر انداز میں خطبات کی صورت میں ہی کلام کرتی ہے۔ خطبات پورے ہندوستان کے طول و عرض سے اپنے لیے گواہی لانے میں کام یاب ہوئے ہیں کیوں کہ ان کی بازگشت اپنے وقت میں بھی اور آج بھی دور و نزدیک سنائی دیتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کی افادیت و اہمیت میں اضافہ ہوتا جائے گا کیوں کہ آئندہ کی جدید تحقیق جن ذرائع کو بہ طور سچائی قبول کرے گی اُن میں خطبات کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے اکابرین کی ایک بڑی تعداد فن خطابت کے معیار پر پورا اُترتی رہی اور اس فن کے ذریعے انھوں نے کئی ان مول جواہر ہم تک پہنچائے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(1) The Random House Dictionary College edition Diony, sius of Halicarnassus. p-934

(2) Ibid. p-1132

(۳) نذیر الدین احمد، رموز خطابت،، حیدر آباد، انجمن اشاعت علم و ادب، ص ۱۲

(۴) آغا حسین ہمدانی، مرتب، دستاویزات آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اسلام آباد، قومی ادارہ تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۶، ص ۱۱، ۱۲

(۵) ایضاً، ص ۶۳، ۶۴

(۶) محمد سرور، مرتب، خطبات مولانا عبید اللہ سندھی، لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی، ۱۹۸۷، ص ۴۴

(۷) ایضاً، ص ۴۸، ۴۹

(۸) آغا حسین ہمدانی، مرتب، دستاویزات آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اسلام آباد، قومی ادارہ تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۶، ص ۱۳

(۹) سید معین الرحمن، ڈاکٹر، مجموعہ مطالعات عبدالحق، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳، ص ۳۱۵

(۱۰) معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۱، ص ۷

(۱۱) ایضاً، ص ۱۴۰

❖❖❖